ڈاکٹر عبد الشکور

لیکچرار شعبہ اردو

فیڈرل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ایچ ایٹ، اسلام آباد

# اردو ناول میں سائنسی فینٹسی کے عناصر

## Elements of Scientific Fantasy in Urdu Novel

Fantasy is an element of legend or a story which is weird ridiculous and far from reality.Science fantasy is a part of it which can be seen in any genre of fiction.Therein humans of future and life on other planets other than the earth is projected.Movies and dramas predominantly employ science fantasy.Science fantasy has crept into Urdu novel through the influences of eastern dastaans and western novels.The piece attempts to find out and analyse the elements of science fantasy in Urdu novels.

**کلیدی الفاظ:** فینٹسی، ناول، سائنسی، ہیرو، دوسری دنیا، جادو، تعجب، تحیر، مافوق الفطرت، روبوٹ، کلون۔

فینٹسی (Fantasy) کسی بھی قصہ یا کہانی کا وہ عنصر ہے جو بے بنیاد، حقیقت کے بر عکس، وہم پر مشتمل، دوسرے منطقوں کے متعلق، عجیب و غریب، طلسماتی، مضحکہ خیز اور بے مہار تخیل کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس میں نا قابل یقین واقعات کی کثرت ہوتی ہے۔ فرشتے، دیوی ،دیوتا، صاحب کرامت ہستیاں، جن، بھوت، چڑی، پریاں، جانور، پرندے، مشینیں، روبوٹ، جادوگر اور فوق العام ہیرو بطور کردار شامل ہوتے ہیں۔ فینٹسی کے عناصر درج ذیل ہیں:۔

۱۔ بولتے اور فکر و فرزانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حیوانات۔

۲۔ بے قابو تاریخ یا زمانہ

۳۔ مثالی انسانوں کے کارنامے

۴۔ پریوں کی کہانیاں

۵۔ اساطیر

۶۔ سحر

۷۔ دوسری دنیا کا منظر نامہ

۸۔ زمین کے علاوہ باقی سیاروں پر انسانی آبادی

۹۔ نرگسیت

۱۰۔ مثالیت پسندی

۱۱۔ وہ سائنسی موضوعات جو بعید از حقیقت ہوں

سائنسی فینٹسی کی اصطلاح اردو ادب میں مغربی تنقید کے راستے سے داخل ہوتی ہے۔ لیکن اس کی موجودگی کے اولین نقوش مشرقی داستانیں اور قصے کہانیاں ہیں۔ اردو ادب کی اہم داستان "طلسم ہوش ربا" کو سائنسی فینٹسی کی عمدہ اور کلاسک نظیر کہا جاسکتا ہے۔ سائنسی فینٹسی سائنس فکشن کے بہت قریب ہے، تاہم ہر وہ فن پارہ جو سائنس فکشن ہو اسے سائنسی فینٹسی میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ان دونوں اصطلاحات میں فرق یہ ہے کہ سائنس فکشن حقیقت کے قریب ہوتا ہے جب کہ سائنسی فینٹسی کا تعلق مافوق الفطرت اور خارق العادات کرداروں اور باتوں سے ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر سائنس فکشن اور فینٹسی میں کوئی حد فاصل قائم نہیں کرتے اور سائنس فکشن کو ہی فینٹسی کا جہان قرار دیتے ہیں[1] جو کہ درست نہیں ہے۔

سائنسی فینٹسی کے عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ یہ فینٹسی بیشتر مستقبل میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔

۲۔ انسان کا مستقبل اس کا بڑا عنصر ہے۔

۳۔ اس میں مصنف مختلف دنیاؤں کے حالات ضبط تحریر میں لاتا ہے۔

۴۔ زمین کے علاوہ مختلف سیاروں پر انسانی آبادی دکھائی جاتی ہے۔

۵۔ خلاؤں میں زندگی دکھائی جاتی ہے۔

۶۔ اڑن طشتریاں، ٹائم مشین اور راکٹ ہوتے ہیں۔

۷۔ اس فینٹسی میں غیر یقینی باتوں کی کثرت ہوتی ہے۔

۸۔ فلموں اور ڈراموں میں بھی اس فینٹسی کے عناصر کثرت سے موجود ہوتے ہیں۔

۹۔ روبوٹ اس کے اہم کردار ہوتے ہیں۔

سائنسی فینٹسی کے عناصر افسانوی ادب کی تمام اصناف میں سما سکتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ کو مد نظر رکھا جائے تو اس کا نقش اوّل ہمیں داستان سے ملتا ہے۔ اردو داستان اور مغربی ناول کے اثرات سے یہ عناصر ہمیں ناول اور افسانے میں نفوذ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردو ناول میں سائنسی فینٹسی کی ابتدائی جھلک محمد خالد اختر کے پہلے ناول "بیس سو گیارہ" (۱۹۵۰ء) میں نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد درج ذیل ناولوں میں سائنسی فینٹسی عناصر کثرت سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

۱۔ مشینوں کا شہر (۱۹۷۱ء) ۲۔ پاگل خانہ (۱۹۸۰ء)۔ وادئ گماں میں (سن ندارد)

۴۔زینو (۲۰۰۳ء۵۔کلون(۲۰۱۴ء)

## مشینوں کا شہر (۱۹۷۱ء)

"مشینوں کا شہر" اردو ادب کا پہلا مکمل سائنسی فینٹسی ناول ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے سائنسی فینٹسی کے ضمن میں صرف حجاب امتیاز علی کا نام لیا ہے[۲]۔ حالاں کہ کرشن چندر نے ان سے قبل اس فینٹسی کا حامل ناول "مشینوں کا شہر" تخلیق کیا ہے۔ ناول میں سائنس کے مستقبل کی بابت بات کی گئی ہے جو کہ مافوق الفطرت ہے۔اس بنیاد پر اسے سائنس فینٹسی عنصر کہا جائے گا۔اس کے علاوہ روبوٹ کردار کی حیثیت سے شامل ہیں یہ بھی سائنسی فینٹسی کا اہم عنصر ہے۔ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے ناول کے مرکزی خیال کو کارل چیک کے مشہور ڈراما "آر۔ یو۔ آر"(R.U.R) سے ماخوذ قرار دیا ہے[۳]۔ناول میں پیش کی گئی کہانی کی رو سے ۱۹۹۵ء تک انسان نے چاند پر بہت سی آبادیاں قائم کر لی تھیں۔شہاب ثاقب سے بچنے کے لیے پلاسٹک کے گنبد تیار کیے گئے تھے۔ان گنبدوں میں انسانی ضرورت کی تمام چیزیں میسر تھیں۔ان میں پھل، پھول، پارک، سینما، سکول اور دکانیں شامل تھیں۔اگرچہ یہاں انسان اپنے تئیں پر سکون اور محفوظ سمجھ رہا تھا مگر ۲۲۴۰ء میں گرنے والے شہاب ثاقب نے تمام گنبد تباہ کر ڈالے۔ اس تباہی سے بہت سے انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ محض چند ہزار لوگوں کو راکٹوں کے ذریعے واپس زمین پر لایا جاسکا۔

چاند پر موجود قیمتی دھاتوں کے حصول کے لیے تین سائنس دانوں پروفیسر اجے کمار گھوش، پروفیسر پانڈورنگ پاٹل اور پروفیسر جاوید ملک نے روبوٹ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔روبوٹ کی ایجاد سے دنیا بھر میں صنعتی انقلاب آ گیا۔مل مالکان کے منافع میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔اب فیکٹریوں میں اس نقلی انسان سے کام لیا جانے لگا اور اصلی انسان کو نکال باہر کیا گیا۔

یہ نقلی انسان جسے دور حاضر میں روبوٹ کہا جاتا ہے چیک زبان کے لفظ "روبوٹا" سے اخذ کیا گیا ہے جس کے مطلب لازمی اور زبردستی مزدوری یا اکتا دینے والے کام کے ہیں۔روبوٹ کا لفظ سب سے پہلے جمہوریہ چیک کے ڈراما نویس کیرل کیپک نے ۱۹۲۰ء میں اپنے ڈرامے میں استعمال کیا ہے۔جب کہ تاریخ انسانی میں اولین روبوٹ یونانی ریاضی دان ارقیطس نے ۴۰۰ قبل مسیح میں تیار کیا۔اس کی شکل کبوتر سے ملتی جلتی تھی۔یہ روبوٹ بھاپ کے ذریعے دو سو میٹر تک مائل بہ پرواز رہا تھا۔[۴]

روبوٹس ایسی مشینیں ہیں جو میکانکی حدود میں رہ کر کام کر سکتی ہیں۔یہ بشری فہم و ادراک اور جذبوں سے خالی ہوتی ہیں۔اگر ان میں پروگرامنگ کی جائے تو یہ انسانی ذہانت اور فیصلہ سازی کی صفات کی کسی حد تک نقل کر سکتی ہیں۔لیکن احساس، حساسیت اور تخلیقی صلاحیتوں سے یہ خالی ہوتے ہیں۔پہلا انسان نما روبوٹ جاپان کی ہنڈا کمپنی نے تیار کیا۔دور حاضر میں زیادہ تر روبوٹ اسی کی تقلید میں تیار کیے گئے ہیں۔

"مشینوں کا شہر" چوں کہ فینٹسی ناول ہے اس لیے اس میں شامل روبوٹ انسانوں کے بہت قریب ہیں۔ان کی انسانوں کی طرح جلد ہے۔یہ احساس اور حساسیت سے متصف ہیں۔بہترین روبوٹ روح کے مالک بھی ہیں۔اتنے قیمتی نقلی انسان تیار کرنے کی وجہ سے اس فیکٹری کی کڑی نگرانی کی جانے لگی جس میں یہ بنتے رہے ہیں۔ نقلی انسانوں کے اس کارخانے میں ہر کس و ناکس نہیں جا سکتا تھا۔زمیں کے صدر محترم اوڈاما کی لڑکی سیما سولہ برس کی ہوئی تو نقلی انسان کی اس فیکٹری کو دیکھنے کی فرمائش کی۔جب وہ یہاں پہنچی تو اسے پروفیسر

اجے کمار گھوش کے بیٹے نریندر گھوش نے پوری فیکٹری دکھائی۔ اگرچہ نریندر گھوش ایک خوش شکل نوجوان تھا لیکن فیکٹری میں وقت گزارنے کے کارن وہ بھی مشینوں کی طرح زندگی گزارتا تھا۔ اسے سائنس پر مکمل عبور حاصل تھا۔ عرف عام میں یہ بادل کے نام سے بھی پکارا جاتا۔ جب اس نوجوان سائنس دان نے اپنا نام بادل بتایا تو سیما نے متحیر ہوتے ہوئے کہا:

> بادل واقعی پیارا نام ہے۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ بادل نام رکھنے والے نوجوان نے آج تک بادل نہیں دیکھے۔ سورج کو چمکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چاند کو چٹکتے نہیں دیکھا۔ شفق کو پھوٹتے نہیں دیکھا۔ اس گہرے سناٹے کو محسوس نہیں کیا جو گہری ہوتی ہوئی شام کے سایوں میں کسی سمندری ساحل کے کنارے بیٹھ کر محسوس ہوتا ہے۔[5]

بادل نامی یہ نوجوان اپنی زندگی کے سارے لمحات فیکٹری میں گزار چکا تھا۔ اس نے باہر کی دنیا کو نہیں دیکھا تھا۔ اسی لیے اس کا دل و دماغ حسن اور اس کی کرشمہ سازیوں سے مکمل طور پر نابلد تھا۔ سیما کو دیکھتے ہی اس میں حیران کن طور پر ایک ارتعاش پیدا ہوا اور وہ کہنے لگا :

> سائنس بہت اچھی ہے مگر تمہیں دیکھ کر معلوم ہوا کہ وہ سب کچھ نہیں ہے۔ اس دنیا میں سائنس سے بھی قیمتی چیزیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر انسان، عورت، بادل، پھول، سمندر کا مدوجزر۔۔۔دل میں اٹھتی ہوئی ترنگیں۔۔۔۔۔۔تم۔۔۔۔۔[6]

نقلی انسان کی مانگ میں ہر طرف اضافہ ہونے لگا۔ کیوں کہ روبوٹ عام انسان سے طاقت میں کئی گنا زیادہ تھا۔ کام کے بدلے میں اسے خوراک، لباس اور تنخواہ کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ سرمایہ داروں کو ایسے ہی انسان کی ضرورت تھی جس کا معدہ نہ ہو، جگر اور سینہ بھی نہ ہو تاکہ کوئی خواہش اسے کام سے نہ روک سکے۔ سرمایہ دارانہ نظام چاہتا ہے کہ مزدور کی زبان بھی ایسی ہو جو بول تو سکے لیکن اس میں حس ذائقہ نہ ہو۔ بہت سے اعضاء سے محروم ہونے کی بنا پر نقلی انسان منافع بخش تھا۔ ٹیکنالوجی کے بہتر استعمال سے یہ بھی انقلاب برپا ہوا کہ نقلی انسانوں میں روح آ گئی ان میں جذبات کا تلاطم سامنے آنے لگا۔ محبت، نفرت، خوشی اور غمی ان کی زندگیوں میں شامل ہونے لگی۔ احساس، جذبات اور روح کی موجودگی نے روبوؤں کو بغاوت پر اکسایا۔ اپنے حقوق کے حصول کے لیے ان روبوؤں نے ایک لیگ بھی قائم کر لی۔ اس لیگ کا مرکزی نکتہ انسانوں کے خلاف اتحاد قائم کرنا تھا۔ اب نقلی انسانوں کی یہ خواہش شدت اختیار کرنے لگی کہ انسانوں پر ان کی حکومت ہونی چاہیے۔ اپنی اجارہ داری کا خواب مکمل کرنے کے لیے روبوؤں نے ایک روز بغاوت کا اعلان کر دیا۔ نقلی انسانوں نے اسلحہ خانوں، بجلی گھروں، ہوائی جہازوں، راکٹوں، ذرائع ابلاغ، مواصلاتی نظام، بندرگاہوں اور ریل پر قبضہ جما لیا۔ نقلی انسانوں کی بین الاقوامی لیگ نے انسان کو اپنا دشمن قرار دیتے ہوئے اسے کائنات کے لیے ایک بدنما داغ قرار دیا۔ روبوؤں نے خود کو انسان سے زیادہ ذہین قرار دیا۔ ان کی دلیل تھی کہ دنیا کا سارا کام وہ کرتے ہیں جب کہ عیاشی انسان کے حصہ میں آئی۔ اب یہ ظلم نہیں ہو گا۔ انسان ایک پیراسائیٹ ہے۔[7]

روبوٹ میں روح کا داخل ہونا اور اس سے بڑھ کر اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا نفوذ اور جذبات کا پیدا ہونا بھی فینٹسی ہے۔ اس ناول میں روبوٹ کی موجودگی سے کرشن چندر نے سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کو آسانی سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ روبوٹ میں بہت سی ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو ایک سرمایہ دار کسی مزدور میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ روبوٹ کا معدے سے خالی ہونا اور تھکاوٹ سے بھی پاک ہونا دو ایسے عناصر ہیں جو کسی بھی ہوس کے مارے سرمایہ دار کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔ ناول نویس نے سرمایہ دارانہ ماحول پر اپنے روبوٹ کرداروں کے ذریعے زیادہ کامیابی سے اپنا مقصد پایا ہے۔

روبوؤں نے انقلاب کا جو نعرہ بلند کیا تھا اس کے نتیجے میں زمین اور چاند پر انسانوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ زمین پر صرف ڈاکٹر جاوید کی جان بخشی گئی تاکہ وہ مزید روبوٹ بنائے۔ روبوٹ کی ایجاد نے انسان کو تساہل پسند بنا دیا۔ اس کے کام ہونے لگے تو شرح آبادی میں کمی ہوتی گئی۔ انسانی تاریخ میں بعض سال ایسے بھی گزرے جن میں ایک بھی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ انسانی آبادی معدوم ہوتی گئی۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب اصلی اور نقلی انسانوں کی آبادی میں تناسب ایک اور ہزار کا رہ گیا۔ اب انسانیت کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔

نقلی انسان بنانے کی اس فیکٹری میں تمام مرد روبوٹ بنائے جاتے لیکن ایک لڑکی نمارو بو بھی بنائی گئی جسے ذائقے کی قوت بھی عطا کی گئی۔ اس کا نام شیلا تھا کئی سال کی محنت پیہم کے بعد ڈاکٹر جاوید ارجن نامی ایک مرد بنانے میں کامیاب ہو گیا جس میں ایک خوب رو مرد کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ ارجن اور شیلا ایک دوسرے سے ملے تو ڈاکٹر جاوید کو معلوم ہوا کہ انسانی اوصاف مثلاً قربانی، ایثار اور محبت پیدا ہو چکے۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب نسل انسانی دوبارہ اس زمین پر جنم لے گی۔ جب شیلا اور ارجن اپنی منزل کی طرف جانے لگے تو کسی نے چونک کر استفسار کیا کہ وہ دونوں کون تھے؟

"آدم اور حوا" ڈاکٹر جاوید نے کہا۔

پیش نظر ناول میں کرشن چندر نے جہاں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "بے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت" وہیں وہ سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں لالچ اور ہوس پر تعمیر ہوتی ہیں۔ جو کسی بھی وقت گر کر انسان کے لیے اجل کا پیغام ثابت ہو سکتی ہیں۔ اسی قسم کا اظہار وہ ناول کے کردار ڈاکٹر پائل کے بیان کی صورت میں کرتے ہیں:" منافع کا بھوت ہمارے دماغ پر سوار تھا بالکل اسی طرح جس طرح ہم روبو پر سوار تھے۔ روبو ہمارا غلام تھا۔ ہم منافع کے غلام ہو گئے"۔[۸]

کرشن چندر نے اس سائنسی فینٹسی ناول میں سرمایہ داروں کی زر پرستی کی بدولت دنیا کو تباہ ہوتا دکھایا ہے۔ تخلیق کار کی امید پسندی اور رجائیت نے معجزاتی انداز میں پھر نسل انسان کو خاتمے سے بچا لیا ہے۔ ابن آدم کی زندگی کو جس انداز میں ناول نویس نے یہاں محفوظ بنایا ہے وہ بھی فینٹسی ہے۔

## پاگل خانہ (۱۹۸۰ء)

بر صغیر پاک و ہند کی پہلی مسلمان خاتون ہوا باز[۹] حجاب امتیاز علی (۱۹۰۳ء۔۱۹۹۹ء) اردو ادب میں افسانہ نویس، ڈراما نگار، ناول نویس اور مترجم کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ حجاب کے ناولوں میں "ظالم محبت" (۱۹۴۱ء)، "اندھیرا خواب" (۱۹۵۰ء) اور "پاگل خانہ" (۱۹۸۰ء) شامل ہیں۔ اول الذکر دونوں ناولوں کا موضوع محبت ہے۔ شاید اسی وجہ سے حجاب امتیاز علی کو رومانویت پسند ناول نگار کے طور پر شہرت حاصل ہوتی ہے۔ تاہم ان کا تیسرا اور آخری ناول "پاگل خانہ" رومانوی پر چھایوں کے ساتھ ساتھ سائنس کے مضر اثرات اور بالخصوص ایٹمی تباہ کاریوں کو موضوع بناتا ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر سید جاوید اختر نے بالکل درست تحریر کیا ہے کہ "پاگل خانہ" سائنس کے ہاتھوں اس دنیا کی تباہی و بربادی کا مرثیہ ہے۔"[۱۰]

"پاگل خانہ" سائنسی فینٹسی ہے اور اس میں مستقبل کی سائنس کی بابت پیش آنے والے سنگین مسائل کو تخیلاتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا عنوان بھی فینٹسی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عنوان کی رو سے مصنفہ نے دنیا کو پاگلوں کا ٹھکانہ قرار دیا ہے جس کا تعلق فینٹسی سے بنتا ہے۔ ناول میں سائنسی فینٹسی کے عناصر کو حجاب امتیاز علی نے اس قدر کامیابی سے بیان کیا ہے کہ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم نے اس تصنیف کو ان کی ادبی زندگی کا ایک اہم موڑ اور ان کے فکر و نظر میں آنے والی تبدیلیوں کا غماز ہے۔ مزید وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ حجاب کو اپنے ناولوں میں یہ بے حد پسند تھا''۔ ناول کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ممتاز تخلیق کار اور کالم نویس زاہدہ حنا نے تو اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اسے ہمارے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے [۱۲]۔

تخلیق کار معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ جس سوسائٹی میں وہ زندگی کے پل گزارتا ہے اس کے اثرات اس کے ذہن پر نقش ہو کر تحریر کی صورت میں منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ یہی صورت حال حجاب امتیاز علی تاج کی بھی ہے۔ وہ معاشرے میں موجود انارکی، ظلم و تشدد اور سفاکیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ اس کی واضح مثال ۱۹۷۰ء میں ان کے شوہر امتیاز علی تاج کا قتل ہونا ہے۔ اسی بابت ڈاکٹر غفور شاہ قاسم نے موت، بھوت، بڑھاپے، انتشار، قتل و غارت گری، ماحولیاتی آلودگی اور ذہنی امراض جیسے مسائل کا نتیجہ "پاگل خانہ" کو قرار دیا ہے جو کہ بالکل درست ہے۔ [۱۳]

روحی، شوشوئی اور ڈاکٹر گار ناول کے اہم کردار ہیں۔ ناول کا ماجرا روحی کی زبانی پیش کیا گیا ہے۔ روحی ایک حساس لڑکی ہے۔ اسے شدت سے محسوس ہوا کہ ملک کے حالات خرابی کی طرف جا رہے ہیں۔ لوٹ مار، قتل و غارت گری، سنگ باری، اچانک حملے اور آتش زنی روزمرہ کا معمول ٹھہرا ہے۔ انسان کا کردار اور اخلاق اہمیت کھو چکے ہیں۔ ان بڑھتے جرائم سے روحی جیسی حساس لڑکی یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے تمام ہم وطن پاگل ہو چکے ہیں۔ ملک ان پاگلوں کی وجہ سے ایک وسیع پاگل خانے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اسی مجبوری کے کارن روحی ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ناول کی مرکزی کردار جب تلاش امن میں اپنا ملک چھوڑ کر بذریعہ سفر کرتی ہے تو اس کے ساتھ شوشوئی اور ڈاکٹر گار بھی ہوتے ہیں۔ جونہی جہاز ہوا کے دوش پر اڑتا ہے تو ان امن پسندوں کا خواب چکنا چور ہو جاتا ہے کیوں کہ وہاں جہاز کو اغوا کرنے والے ہائی جیکرز اپنی کاروائی کا آغاز کر دیتے ہیں۔ اغواکاروں سے سب سے پہلا سوال روحی نے یہ کیا کہ تم نے یہ جہاز سیاسی یا ذاتی کس مقصد کے لیے اغوا کیا ہے؟ اغواکاروں کے جواب نے روحی کو متعجب کر دیا۔ وہ بولے انفرادیت کے جذبے سے، اپنی بہادری دکھانے کے لیے انہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ ان کے اس جواب پر تمام مسافر ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔

یہی پاگل پن "پاگل خانہ" کا مسئلہ ہے۔ حجاب امتیاز علی اس پاگل پن کا سبب سائنسی تخریب کاریوں کو قرار دیتی ہے۔ بلاشبہ سائنس کی بہت سی مفید ایجادات سے انسانی زندگی میں سکون اور اطمینان آیا لیکن ہوا، غذا اور پانی بھی اسی کی وجہ سے زہر آلود ہوئے ہیں۔ سائنس کی تخریب کاری میں بڑھوتری کا اہم سبب انسانی جبلت میں شامل شوق حکمرانی ہے۔ دوسرے انسانوں کو غلام بنانے اور ان کی زمین پر قبضہ جمانے کے نشہ میں بدمست ہو کر انسان خود اپنے بھائی بندوں کو لقمۂ اجل بنانے کی ناپاک سعی میں شب و روز ایک کیے ہوئے ہے۔ ظلم کی انتہا یہ ہے کہ ان انسانی تباہیوں اور بربادیوں کا پروردگارانِ سائنس کو بھی اچھی طرح علم ہے۔ مگر وہ انسانیت کے سروں پر منڈلاتے ان مہیب خطرات سے چنداں پریشان نہیں اور نہ ہی سادہ لوح عوام کو اس تلخ حقیقت کا شعور عطا کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بموں کی صورت میں جو قیامت برپا ہوئی اس کا سبب یقیناً خداوندان سائنس کی کم عقلی اور پاگل پن ہیں۔ اب مصنفہ کو یہ خوف

لاحق ہے کہ مستقبل میں جاپان میں ہونے والی بربادی کی طرز پر سائنس دان دنیا کو نیوٹران بم سے تباہ نہ کر دیں۔اس ناول کا سب سے بڑا فینٹسی پہلو یہی ہے۔ یہاں ناول نگار نے انسانوں کی فکری کوتاہیوں کو پیش کیا ہے۔ انسان کی یہ حماقت کہیں زندگی کو اس دھرتی سے تلف نہ کر دے۔مصنفہ کے مطابق نیوٹران جیسا خطرناک اور بے امان بم ۱۹۶۳ء میں امریکی سائنس دان مسٹر سیمیوئیل کوہن کی شراکت میں بن چکا ہے۔ جب اس سلسلے میں بغداد آبزرور (Baghdad Observer) کے نامہ نگار نے سیمیوئیل کوہن سے سوال کیا تو وہ یوں گویا ہوئے:

> مجھے لوگوں کے مرنے کا بالکل افسوس نہیں۔مجھے آدمی کی زندگی کی مطلق پرواہ نہیں۔میری خوشی کا سارادارومدار اس پر ہے کہ میں اپنے ہتھیاروں سے بنی نوع انسان کو موت کے گھاٹ اتار دوں جو ہماری فوجی طاقتوں میں مداخلت کرتے ہیں۔
>
> اخبار کے نامہ نگار نے دوسرا سوال کیا:"مگر غیر متعلقہ لوگ؟جو اس تاب کاری سے متاثر ہو کر ختم ہو جاتے ہیں؟" اس تباہی سے میرا کیا تعلق؟ میں دنیا کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہ مخالفین امریکہ کی انتظامیہ سے سوال کریں۔وہ ان کو جواب دے گی۔لوگ مرتے ہیں تو مریں۔میں خود زندہ ہوں اور میں اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا"[۱۴]۔

سائنس دان ایک ایسا گروہ ہے جنہیں دنیا کا ذہین طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں حجاب امتیاز علی تاج نے فینٹسی انداز میں اس طبقے کی جہالت سے پردہ اٹھایا ہے جو فی الحقیقت دنیا کے گھمبیر مسائل کا ذمہ دار ہے۔

حجاب امتیاز علی کو دکھ لاحق ہے کہ مستقبل کا سورج بھی انسانی حماقتوں کے باعث موت کا پیغام بن جائے گا۔ یہاں مستقبل کے مسائل کو احاطۂ تحریر میں لانا اور چشم تصور سے نئی دنیا کو پیش کرنا بھی ایک فینٹسی ہے۔مصنفہ کے خیال میں اس مہربان خورشید کی تابکاری سے ابن آدم غیر محفوظ ہو جائے گا۔قدرت نے انسان کو سورج کی تابکاری سے بچانے کے لیے زمین کے گرد حفاظتی تہہ بنا رکھی ہے جسے اوزون کہتے ہیں۔سائنسی ایجادات کے طفیل ایک روز یہ چادر تار تار ہو جائے گی۔ ایٹمی تجربات،کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال،کارخانوں کے دھویں اور کیمیائی اشیاء کا بے دھڑک استعمال مسلسل اوزون کو تہس نہس کرنے پر لگے ہوئے ہیں جس سے سورج کی تابکاری زمین پر ایک بڑا خطرہ پیدا کر گئی۔ یہاں کی زندگی مہیب خطرات کی لپیٹ میں آجائے گی۔کچھ خطرات جیسے موسموں میں تغیر اور کینسر کی وباء کا عام ہونے سے ہم پہلے سے ہی نبرد آزما ہیں۔

ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو ایٹمی قیامت برپا ہو چکی ہے مصنفہ فینٹسی کے توسط سے یہ بتاتی ہے کہ اس کے اعادے سے کہیں عالم انسانیت کو ایک بار پھر تباہی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ہو سکتا ہے کہ آج کے محفوظ کرۂ اراضی مستقبل قریب یا بعید میں ان ہتھیاروں کی خوف ناک زد میں آجائیں۔ یہ کھیت، فصلیں، فضائیں مسموم ہو جائیں اور انسانی زندگی خطرے میں گھر جائے۔طاقت کے نشے میں مست انسان کو کچھ نہ سوجھے اور دنیا میں رائج اخلاقیات، سیاسیات اور بین الاقوامی قوانین طاق نسیاں کی نظر ہو جائیں۔انسان اپنے آپ کو طاقت کا مرکز سمجھ کے زندگی کو ختم کر دے۔ناول نویس کی نگاہوں میں بنی نوع انسان کا مستقبل مخدوش ہے۔وہ چاہتی ہے کہ انسان احمقوں کی جنت میں نہ رہے بلکہ تلخ حقائق کو مد نظر رکھ کر اپنی اور اپنی نوع کو محفوظ رکھنے کے لیے فکر مند ہو جائے۔اگر آج اس نے سنجیدگی سے اپنی

حماقت اور غلطیوں کا ازالہ نہ کیا تو اس کا انجام سوائے موت کے اور کچھ بھی نہیں۔ انسانی کاہلی بھی شیرازہ ہستی بکھیرنے میں معاون ہو سکتی ہے۔ پھر پوری زمین دہکتے ہوئے انگارے میں تبدیل ہو جائے گی۔ پانی، ہوا، سبزیاں، مچھلی سب زہر میں تبدیل ہو جائیں گے۔ آکسیجن کم ہو جائے گی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ بڑھ جائے گی۔ عجیب و غریب قسم کے جرائم اور انسانی قتل کا شوق اور جنون بلندیوں پر جا پہنچے گا۔ یوں درج بالا تمام عوامل انسانی زندگی کی کھیتی کو خشک کر دیں گے۔ شہر، ملک، دیہات تنکوں کی طرح بہہ جائیں گے۔

مشینی آدمی یعنی روبوٹ کی ایجاد پر بھی حجاب امتیاز علی متفکر نظر آتی ہیں۔ جب اس نے انسان کی پیدا شدہ اس انوکھی مخلوق کے متعلق سنا تو اس پر گہری تشویش کا اظہار کیا۔ اخبارات کی شہ سرخیوں میں نقلی انسان کی منفی سرگرمیوں کو جگہ ملی تو مصنفہ کے اضطراب میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اب وہ ایٹم بم کی طرح انسانی اختراع کو بھی امن عالم کی تباہی کے ذمے دار کے طور پر دیکھتی ہے۔ ان کے خیال میں یہ بھی ممکن ہے کہ یہی مخلوق ایٹم بم گرا کر اس دنیا کا خاتمہ کر دے۔

الغرض روحی ڈاکٹر گار اور شوشوئی جہاں بھی گئے اپنی آنکھوں کے سامنے امن عالم تہہ و بالا ہوتا دیکھا۔ اسی لیے روحی نے کہا کہ گویا ایک دوزخ سے نکل کر دوسری دوزخ میں پہنچ گئے۔[۱۵]

اس بربادی کا سبب مصنفہ نے مسموم ہواؤں، غذاؤں اور پانی کے سبب انسانی پاگل پن کو قرار دیا۔ حجاب کے خیال میں اس دیوانی مخلوق کے سبب یہ دنیا کاہے کو ہے پاگل خانہ ہے۔ اس کا ہر پاگل اپنی جگہ معتبر اور امن کا خواہش مند ہے مگر شاید اب اس دنیا میں انہیں امن کہیں نہ ملے[۱۶]۔ کیوں کہ تمام دنیا ایٹمی دھماکوں کی زد میں ہے۔ دنیا کی آبادی کسی بھی لمحے ایٹمی حملے کے اثرات سے ختم ہو جائے گی۔

حجاب امتیاز علی کا یہ فکری ناول انسانیت کے دکھوں کے متعلق تخلیق کیا گیا ہے۔ اس فلسفیانہ ناول کی ایک اور بڑی خوبی مستقبل بینی ہے۔ سائنسی فینٹسی کا حامل یہ ناول ہر دور میں اپنی انفرادیت کی صدا لگاتا رہے گا۔ اس کی درج بالا خوبیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ حجاب امتیاز علی نے یہ ناول لکھ کر اس امر کا یقین دلایا ہے کہ ان کے یہاں فکری سطح پر ایک ایسی تبدیلی آئی ہے جو اہم ناولوں کی تخلیق کا سبب بن سکتی ہے۔[۱۷]

## وادیٔ گماں میں

رحیم گل (۱۹۲۴ء-۱۹۸۵ء) نے نثر کی متنوع جہات میں تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ انہوں نے افسانہ، ڈراما، خاکہ اور ناول جیسی اصناف میں اپنی ریاضت اور خداداد صلاحیتوں سے پرکشش اضافے کیے۔ رحیم گل کی رشحات قلم کا ایک منفرد اعتبار اور انداز ہے تاہم ان کی بنیادی پہچان ناول قرار پایا۔ "وادیٔ گماں میں" جیسے ناول تخلیق کر کے اردو ادب کو پرمایہ کیا۔

"جنت کی تلاش "کے بعد رحیم گل کا ناول "وادیٔ گماں میں" طویل عرصہ تک زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ سائنسی فینٹسی ناول ہے کیوں کہ اس کا منظر نامہ خلائی دنیا کو پیش کرتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ دنیا آج سے دس ہزار سال قبل کی ہے۔ شاہ یاقوت، زیب النساء، زرین، ثمرین، ڈاکٹر ضیاء، رضا اور چنگیز ناول کے اہم کردار ہیں۔ ان سب کے دل حسین خوابوں کی آماجگاہ ہیں۔ کوئی مریخ پر جانا چاہتا ہے، کوئی دب اکبر پر تو کوئی مختلف ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا متمنی ہے۔ ایک لمحہ ایسا آیا کہ چنگیز، زرین، ڈاکٹر ضیاء اور رضا کی قسمت سعید

انہیں ستاروں کی طرف جانے کا موقع عطا کرتی ہے۔ فینٹسی انداز میں یہ کردار شاہ یاقوت کے حکم سے اس کے خصوصی طیارے میں بیٹھ کر دو سال کے عرصہ میں کرۂ یاقوت پہنچ جاتے ہیں۔ کرۂ یاقوت پر شاہ یاقوت کی حکمرانی ہے۔ شاہ یاقوت "وادئ گماں میں" کا فینٹسی کردار ہے۔ کرۂ یاقوت جیسا مثالی ملک اسی بادشاہ کی مرہون منت قائم ہوتا ہے۔ اس جنت نظیر ارضی کی تمام مخلوقات اس کا حکم مانتی ہیں۔ انسان، حیوان، چرند، پرند اور ارواح سبھی انہیں اپنا آقا تسلیم کرتی ہیں۔ شاہ یاقوت دنیا کے ہر عمل سے آگاہ رہتے ہیں۔ مقام حیرت یہ بھی ہے کہ کرۂ یاقوت کا بادشاہ جو بھی سوچتا ہے وہ اگلے روز مکمل ہو کر باقی انسانوں کے سامنے ہوتا ہے۔ شاہ یاقوت نے آب حیواں تخلیق کیا جسے نوش کرتے ہی موت بڑھاپا اور بیماریاں انسانی جسم سے دور ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر مردہ لوگوں کی ارواح کو بھی سامنے لانے پر قادر ہے۔ کرۂ ارضی سے جانے والے افراد خواہش پر شاہ نے لیلیٰ، فرعون مصر، نپولین بوناپارٹ، گوتم بدھ اور ہٹلر کی ارواح کو سامنے کھڑا کرتا ہے۔ فرعون مصر کی روح شاہ یاقوت کے رعب سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ جب زمین سے کرۂ یاقوت پر جانے والے کرداروں میں سے کسی نے شاہ یاقوت کے متعلق سوال کیا تو کرۂ یاقوت کا باشندہ بتاتا ہے کہ شاہ یاقوت ہمارے شعور کی علامت ہے۔ وہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں سے ذہانت کی شعائیں پھوٹتی ہیں اور زندگی کا مقصد سامنے آتا ہے۔ وہ صداقت کا ایسا مرکز ہے جہاں سے خیر و حسن کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ان کے احکام نیکی کی دستاویز ہیں جن کی تعمیل میں بے پایاں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ شاہ یاقوت کائنات کا ایسا حاکم ہے جس نے اپنے معاشرے میں ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق مٹا کر رکھ دی۔ وہ خیر و عافیت کی علامت ہے۔ ایسی علامت، ایسی بلاغت، ایسی طاقت جس نے انسانی فطرت سے شر کی جڑ کو بیخ اکھاڑ پھینکا ہے۔ مگر پھر بھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔[۱۸]

کرۂ یاقوت حقیقت سے ہٹ کے ہے اس لیے یہ بھی ایک فینٹسی ہے۔ یہاں کا ہر منظر اور کردار فینٹسی ہے۔ "زمین سے جانے والے کرداروں کو شاہ یاقوت کے سپاہی بتاتے ہیں کہ ان کے کرہ پہ دکھ نہیں ہے۔ بھوک، مکان اور جنسیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ حسن بے پایاں اور فراواں، جسے چاہو وہی مل جاتا ہے۔ وہاں کوئی پابندی نہیں ہے۔ جرم اور مجرم وہاں نہیں ملتے۔ ہماری دنیا آپ کی دنیا سے یکسر مختلف ہے۔"[۱۹]

کرۂ یاقوت ایک جنت ارضی تھی۔ جو مصنف کے خوابوں سے تیار کردہ بعید از حقیقت اور فینٹسی ہے۔ وہاں کے رہنے والے جو طلب کرتے انہیں عطا ہوتا۔ دنیا و مافیہا کی ہر نعمت وہاں میسر تھی۔ کثافت جسم سے غیر مرئی دھوئیں کے انداز میں خارج ہو جاتی۔ بیماریاں، بڑھاپا قریب نہیں بھٹکتے۔ آب حیواں پینے کے بعد ہر انسان دائمی زندگی کا مالک بن جاتا۔ ہائیڈروجن بم اور ایٹم بم کی تباہ کاریوں کا یہاں کوئی خوف نہ تھا کیوں کہ یہاں انہیں انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ توانائی بحران سے بھی یہاں کے لوگوں نے سورج کی روشنی کو ذخیرہ کر کے نجات پالی تھی۔ بیماریاں پھیلانے والے جراثیموں کو یہاں مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔ جنگ، نفرت اور بدامنی کی یہاں گنجائش نہ تھی۔ یہاں صرف پیار اور محبت کا راج تھا۔

اس حسین و جمیل اور منفرد خطہ پر موجود انسانوں کو کرۂ ارض کی ساری زبانیں ازبر تھیں۔ اس کرہ کی تہذیب زمین پر آباد انسانوں کی تہذیب سے دس ہزار سال آگے تھی۔ یہاں کا ہر شخص کمپیوٹر سے بھی تیز تر عمل کرتا۔ ہماری زمین کے لوگ جو سوچتے وہاں کے لوگ اس کو جان کر فوراً ردعمل بھی دے دیتے۔ یہ تمام باتیں اس مثالی کرہ کے باشندوں کے کامل ارتقاء کی دلیل ہیں۔ اس کے علاوہ جمہوریت یہاں کا حسن تھی۔ آمریت، بادشاہت اور فرعونیت کا یہاں نام و نشان نہ تھا۔ کرۂ یاقوت کے انسان عمل تجدید سے گزر کر لافانی اور لاثانی

زیست کے مالک بن جاتے۔ اس عمل سے اربوں کی تعداد میں روشنی کے ذرات انسان کے جسم میں تحلیل ہو کر بدن کی جملہ کثافتوں کو راکھ کر دیتے۔ نتیجتاً ابن آدم دائمی طہارت اور شادابی کی لافانی عمر حاصل کر لیتے۔ یہاں شاعری بے کار چیز سمجھی جاتی کیوں کہ ہر نعمت کے ہوتے ہوئے یہاں جذبات کی کوئی اہمیت نہ رہی۔

اس عجیب و غریب اور حیرت افزا خطہ جس کا تعلق فینٹسی سے ہے۔ اس میں پہنچنے کے بعد زمین سے جانے والے ایک کردار چنگیز نے اپنی حیرت کا اظہار اس کے متعلق بتایا کہ یہ طلسم ہوش ربا کی نگری تھی۔ سرخ یاقوت کے سربفلک پہاڑ یہاں ایستادہ تھے۔ زمین سرخ یاقوت کے ذرات کی تھی۔ درخت، پودے، ان پر لگے پتے سرخ تھے۔ سرخ ندی نالے، سرخ دریا، سرخ پانی، یاقوت کے پہاڑ سرخ درخت مانند آتش شعلہ فشاں اور مبحوت کر دینے والے تھے۔ کرۂ یاقوت کے چاروں اور سرخ زار بچھا ہوا تھا۔ جس میں کوئی اور رنگ نہیں تھا۔ جو نیلے آسمان کی طرح بے داغ تھا محسوس ہوتے تھے۔[۲۰]

کرۂ یاقوت رحیم گل کی تخلیق شدہ ایک خیالی سلطنت ہے جس کا تعلق ان کی انسان دوست فکر سے جڑا ہے۔ رحیم گل کا یہ خواب رہا کہ کوئی ایسی ریاست ہو جس میں کوئی کسی کا غلام نہ ہو۔ سب انسان آزاد ہوں اور محبت کی فراوانی ہو۔ کسی رہزن کا گزر نہ ہو۔ کوئی کسی کی نظروں میں حقیر نہ ٹھہرے۔ ہر شخص کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں آزادی حاصل ہو۔ اختلاف رائے رکھنے والا بھی ہر صورت محفوظ رہے۔ چاپلوسی اور بے بسی کا خاتمہ ہو جائے۔ لالچ زر، بیماریاں، جنگیں اور خوف سے نجات ملے۔ جہاں سائنس کا مقصد تباہی و بربادی نہ ہو بلکہ امن و حسن کی تخلیق ہو۔ غیبت، سازش اور تنقید اپنے معنی کھو دیں۔ جھوٹ، بغاوت، بد دیانتی، خیانت اور عصبیت نام کی کوئی چیز نظر نہ آئے۔ الغرض ہر طرف محبت ہی محبت ہو۔ ایسا اس دنیا میں تو ناممکن ہے البتہ فینٹسی میں سب روا ہے اور یہاں پیش بھی وہی کی گئی ہے۔

کرۂ یاقوت درج بالا تمام خوابوں اور خیالوں کا مسکن تھا لیکن وہاں کی سب سے بڑی خرابی یکسانیت نظر آتی ہے۔ زمین کی رنگا رنگ اور متضاد ادائیں وہاں ناپید ہیں۔ انسانوں کے قد، رنگت، جسامت، شکلیں اور سوچ تک یکساں ہیں۔ اسی یکسانیت کے سبب ناول کا مرکزی کردار چنگیز وہاں سے تنگ آ جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ صاحب شعور تھے لیکن صاحب جنوں نہ تھے۔ ان میں یہ بہت بڑی کمی تھی۔ یہاں مصنف کا نظریہ جمال پسندی سامنے آتا ہے جس کی رو سے خیر و شر، نیکی و بدی، اچھائی اور برائی سب کے ساتھ وہ زمین کو پسند کرتا ہے۔

چنگیز آب حیواں پینے کے بعد زمین پر واپس آیا۔ امر ہونے کے بعد اب اس کے وہ مسائل نہ تھے جو زمین کے باسیوں کو درپیش تھے۔ کرۂ ارض پر موجود لوگوں سے مختلف ہونے کے باعث اب اس کے دکھ اور الم بھی جدا تھے۔ وہ خود ہی اپنے مستقبل کے متعلق سوچتا کہ اس المیے کا کیا علاج ہے کہ بیمار لوگوں کو تڑپتا دیکھتا رہوں۔ جنازے اٹھتے رہیں، جنگیں ہوتی رہیں، نفرتیں پھیلتی رہیں، صدیاں گزرتی رہیں اور میں پیام اجل سے بے گانہ تاریخ کا واحد گواہ بن کر ہر نئی نسل، پچھلی نسل، اس سے پچھلی نسل اور اس سے بھی پچھلی نسل کی کہانی سناتا رہوں، مگر کرۂ زمین کے دکھ ختم نہ ہوں، کیوں کہ جب میں نہ تھا تو خود تاریخ یہ کام سرانجام دیتی رہی۔[۲۱]

ناول کا ہیرو کرۂ یاقوت سے اپنی محبوبہ ثمرین کے لیے بے حد محبت لے کر آیا تھا۔ ثمرین کے بغیر اسے کرۂ یاقوت جیسا جنت نظیر خطہ ادھورا نظر آیا۔ لیکن جب وہ زمین پر پہنچا تو ثمرین دادی بن چکی تھی۔ چنگیز اسے قطرہ حیات پینے پر رضامند نہ کر سکا جو اسے جواں بنا دیتا۔ محبت کے لیے اپنی جان دے کے اور اپنی پوتی سے کہہ گئی کہ وہ چنگیز سے محبت کرے۔ یوں ان کی محبت کی تکمیل ہوئی۔ چنگیز ثمرین

کی پوتی کو قطرہ حیات پلانے کے بعد ابدی عورت میں بدل گیا۔ اب ان دونوں نے انسانیت کی خدمت کے لیے دنیا بھر میں جانے کا منصوبہ بنایا تاکہ محبت کے آفاقی پیغام کو یہ اقصائے عالم میں پہنچا سکیں۔

ناول کے یہ امر کردار جس طرح زمین کی چھاتی پر محبت، مروت، شفقت، اتحاد و اتفاق اور مساوات کے پھول کھلانے کے متمنی ہو گئے۔ رحیم گل کا بھی یہی فلسفۂ حیات تھا جو انہوں نے اس ناول میں فینٹسی کے توسط سے بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔

## زینو

"زینو" اکیسویں صدی کے ربع اول کا اہم ناول ہے۔ اس کی اہمیت کی بازگشت دور تک سنائی دے گی۔ ناول کی اہمیت کے پیش نظر فکشن نگار اور نقاد محمد حمید شاہد نے اسے مختلف ناول قرار دیا ہے"[۲۲]۔ ناول کے ہیرو کا نام زینو ہے جس کا تعلق یونان سے ہے۔ زینو اپنی محبوبہ کے ساتھ یونان سے دور دراز کے سفر کے لیے نکلتا ہے۔ اس سفر میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات اہمیت کے حامل ہیں۔ ان برف پوش پہاڑوں کی بلندی پر پہنچ کر زینو کا جسم سردی کی شدت برداشت نہیں کر پاتا ہے۔ وقت کا دریا رواں رہتا ہے۔ قبل مسیح کا یہ نوجوان برف میں پڑا رہتا ہے اور اکیسویں صدی کے سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں۔ حسن اتفاق سے اکیسویں صدی میں جہاز پر آئے سیاح اور عظیم سائنس دان برٹل اینڈرسن کی نگاہ ہوا میں معلق ایک جسم پر پڑتی ہے۔ قریب سے مشاہدہ کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ جما ہوا انسان ہے۔ برف کا برتاؤ اس آدمی کے ساتھ حیران کن طور پر مختلف اور دوستانہ ہے۔ اس جمے ہوئے جسم کے ارد گرد بھربھری برف ہے۔ اس کے ارد گرد سخت برف کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اگر وہ تھوڑی سی جنبش بھی کرنا چاہتا تو برف اس کے لیے رکاوٹ نہ بنتی۔

زینو جب کے۔ٹو کے دامن میں منجمد حالت میں ملا تو اس وقت اسے لیبارٹری میں منتقل کیا گیا۔ ابتدائی معلومات کے مطابق برف کے اثر انداز ہونے سے پہلے اس کا دل آدھی دھڑکن میں تھا، جب رکا تھا۔ دل کی شکل، پٹھوں کا تشنج اور ریشوں کی بنت بتاتی تھی کہ بہت سال پہلے جب دل آدھا بھنچا ہوا تھا تو برف نے دل کا درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے گرا دیا تھا برٹل نے تمام اعضائے رئیسہ کا جائزہ لیا جو منجمد جسم کے اندر جمے ہوئے تھے اور اپنی جگہ پر مکمل تھے۔[۲۳]

ہزاروں سال پہلے زینو برف کے اثر سے منجمد ہو کر بھی زندہ رہتا ہے یہ ایک حیران کن اور ناقابل یقین امر ہے۔ بدلتے موسم اور حالات میں اس مافوق الفطرت ہیرو کا موجود رہنا ایک فینٹسی عمل ہے۔ ماضی کی سائنسی تحقیق سے یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ برف کے شدید اثرات جو اس قدر طویل عرصے پر بھی محیط ہوں، ان سے کوئی انسان بچ جائے۔ لیکن یہاں ایک غیر معمولی عمل سے ناول کے مرکزی کردار کی جان ضائع نہیں ہوتی جو کہ ناقابل یقین اور فینٹسی ہے۔

ناول میں مذکور سائنس دان برٹل اسے اپنی لیبارٹری لے جاتا ہے۔ یہاں سائنس دان نے مستطیل بلاک ایک سٹریچر پر رکھا جو شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اب سائنس دان نے لیبارٹری میں بلاک کا درجہ حرارت بڑھایا جس سے اس منجمد جسم کا درجہ حرارت بھی بلند ہوتا گیا۔ اب زینو کی آنکھیں متعدد بار کھلیں۔ اگلی دفعہ اس نے دھیمی آواز میں قدیم یونانی آواز میں سرگوشی کی اور پانی طلب کیا۔ جواب نہ ملنے پر اس شخص نے وہاں موجود ایک خاتون ایوا سے عربی زبان میں کہا پانی چاہیے پیاس لگی ہے۔ اس کے بعد یہ آواز فارسی اور پھر سنسکرت میں گونجی "پانی"۔

سیکڑوں سال برف پوش پہاڑوں کے ساتھ چمٹے رہنے کے بعد بھی سانسوں کا رواں رہنا فینٹسی ہے۔ ناول میں مذکور سائنس دانوں کی علم و حکمت سے اس بے ہوش اور یخ بستہ جسم کو ہوش میں لے آنا سائنس فینٹسی ہے اور یہ مستقبل کی سائنس کے لیے ایک چیلنج ہے جسے "زینو" کے مصنف نے اپنی قوت تخیل سے ممکن کر کے دکھایا ہے۔ سائنس کے علاوہ بھی اس ناول میں مصنف نے کئی علمی اور فکری زاویوں کو بھی بیان کیا ہے جس سے ناول کی قدر و وقعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں تخلیق ہونے والے ناولوں میں یہ ایک اہم اضافہ ہے۔

## کلون(۲۰۱۴ء)

پروفیسر طفیل ڈھانہ کا اصل میدان نیچرل سائنس اور حیوانیات (Zoology) ہیں۔ ملکی سطح کے نامور اداروں میں انہی مضامین میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ اردو زبان میں سائنسی موضوعات پر طویل عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔ قومی اخبارات میں "ارتقاء" کے عنوان سے سائنس اور ارباب سائنس پر قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کا ناول "کلون" بھی اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے جس میں انہوں نے مستقبل کے انسان کا تصور فینٹسی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ امجد طفیل نے اس ناول کی بابت بالکل درست تحریر کیا ہے کہ جینیات کے جدید تجربات اور معلومات کو بنیاد بناتا یہ ناول اردو فکشن میں ایک ایسی جہت نمائی کرتا ہے جو عام طور پر خالی رہتی ہے۔"[۲۴]

"کلون" (مستقبل کا انسان) سائنسی فینٹسی کا حامل جدید ناول ہے۔ اس کی کہانی ناول نویس نے دس ابواب کی صورت میں پیش کی ہے۔ اردو ناول میں اس نئے اور اچھوتے موضوع پر پہلی بار قلم اٹھایا گیا ہے۔ کلوننگ کے عمل کے دوران پیدا شدہ جانور یا بچے کو کلون کہتے ہیں۔ اس سائنسی طرز عمل میں کسی بھی جاندار کی بہت ساری نقول بنائی جاتی ہیں۔ کلون ہمیشہ ایک دوسرے کی ہو بہو کاپیاں ہوتی ہیں اور وہ عمل جس سے یہ کلون بنتے ہیں کلوننگ کہلاتا ہے۔[۲۵]

کلوننگ ایک غیر جنسی عمل ہے جس میں donner cell کا نیوکلیئس یا مرکزہ نکال کر recipent cell میں insert کرتے ہیں۔ اس کے بعد کیمیکل کرنٹ کے ذریعے زائیگوٹ بنتا ہے۔ اس زائیگوٹ سے بچہ جنم لیتا ہے۔ اولین کامیاب کلوننگ ۱۹۹۷ء میں ہوئی جس کے سبب ایک ڈولی بھیڑ کی پیدائش ہوتی ہے۔

"کلون" ایک انسان کی کلوننگ کے عمل سے پیدائش دکھائی گئی ہے۔ چوں کہ سائنس دانوں نے بہت سے معاشرتی اور مذہبی بندھنوں کی وجہ سے اس کارزار میں قدم نہیں رکھا اس لیے راقم الحروف نے اس عمل کو فینٹسی میں شمار کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار پروفیسر پانڈے ہے۔ جامعاتی تحقیق کا پیش رو اور روح و رواں ہے۔ آزادی انساں اور ایجاد و اختراع اس کی زندگی کے مقاصد ہیں۔ یونی ورسٹی میں کلوننگ اسی کی سرپرستی کی وجہ سے پنپ رہی ہے۔ پانڈے نئی تہذیب کو کلون کلچر کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کے خیال میں نیا انسان (کلون) ہی انسان کے مستقبل کو محفوظ کر سکتا ہے۔ کیوں کہ نیا ماڈل پرانے سے بہتر ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں کلون کی مخالفت انسان دشمنی ہے۔ پروفیسر پانڈے کی یہ سوچ فینٹسی سے تعلق رکھتی ہے۔ ناول میں رملہ، وینس، حارث اور رحمت پروفیسر پانڈے کے معاون ہیں۔ ریٹا اور فرینکس چمپنزی (بندر) ہیں۔ یہ بھی پانڈے کے حلقہ میں موجود رہتے ہیں۔

انسانی کلوننگ جو کہ ابھی تک فینٹسی ہے اگر اس پر عمل کیا جائے تو معاشرے میں بہت سی رکاوٹیں اور مسائل سامنے آ سکتے ہیں۔اس سائنسی ایجاد پر اعراضات بھی سامنے آسکتے ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔کلوننگ کو انسانی تہذیب پر حملہ تصور کیا جائے گا۔

۲۔اس سے انسانی وقار مجروح ہو گا۔

۳۔سماجی نظام کی اس سے تباہی ہو گی۔

۴۔معاشرے میں اس سے انتشار پھیلے گا۔

۵۔جرائم میں کلون کے سبب اضافہ ہو گا۔

۶۔فحاشی کو فروغ ملے گا۔

۷۔اخلاقی بے راہ روی پھیلے گی۔

۸۔آبادی میں بے ہنگم اضافہ ہو گا۔

۹۔کرۂ ارض پر انسانی نسل کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔

۱۰۔انسان کا فطری حسن برباد ہو جائے گا۔

۱۱۔یہ قدرت کے معاملات میں مداخلت ہے۔

مذکورہ بالا مسائل اور خدشات کے باوجود اس سائنسی ایجاد کے باوصف مستقبل میں بہت سے ثمرات بھی سمیٹے جا سکتے ہیں۔اس کے فوائد ہمیں جانوروں اور فصلوں کی بہتر اقسام کے پیدا کرنے میں تو نظر آ بھی چکے ہیں۔جانوروں اور مویشیوں کی تعداد میں اس سے اضافہ کر کے معاشی فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔تاہم اس کے استعمال سے انسان اور دیگر جانوروں کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔انسان کے جینوم میں پائے جانے والے نقائص دور کر سکیں گے۔اس کی وجہ سے بیماریاں دور ہونے سے انسان کا مستقبل محفوظ ہو گا۔اسی لیے ناول میں موجود پروفیسر پانڈے کا بیان اس بابت اہمیت کا حامل ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ فطری ارتقا کے نتیجے میں ہمیں جو کوڈ ملا ہے یہ ہمیں ۱۴۰ برس زندہ رہنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ہم میں کوئی بھی ایک سو چالیس سال زندہ نہیں رہتا۔مگر ہمارے کوڈ میں ہر انسان کے لیے ۱۴۰ برس زندگی ہے۔ہم اس صلاحیت میں اضافہ کر سکیں گے۔جین کوڈ کو ماحول کی منفی قوتوں کے خلاف طاقت ور بنا کر زندگی میں اضافہ کر سکتے ہیں[۲۶]

کلوننگ نہ صرف جسمانی حسن بلکہ مصنف کے خیال میں فکری پاکیزگی میں بھی معاونت فراہم کرے گی۔علاوہ ازیں یہ انسان کی ہمہ قسمی محرومیاں دور کرنے میں مفید ثابت ہو گی۔مصنف کے یہ سب خیالات بعید از حقیقت اور فینٹسی ہیں۔اس میں دراصل اس کی خواہش مضمر ہے جس کا تکمیل کو پہنچنا مشکل ہے۔

"کلون" میں پانڈے اور اس کے ٹیم ممبران نے کلوننگ کا پہلا تجربہ چوہے کی ٹانگ جوڑنے پر کیا۔اس تجربے سے ثابت ہوا کہ مستقبل میں کسی بھی جانور کو اپاہج اور لاغر ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔اولین تجربے کے حوصلہ افزا نتائج کے بعد گرین ماؤس کی کلوننگ کی گئی۔اس میں ولمٹ میتھاڈالوجی کو نظیر بنایا گیا۔گرین ماؤس کے بعد فرینکس ماؤس کا کلون بنایا گیا جو چمپنزی تھا۔

پانڈے کی ٹیم نے کلوننگ پر کام جاری رکھا اور بالآخر انسان کا کلون سامنے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ناول کی رو سے پہلا انسان حارث ہے جس کا کلون بنایا جاتا ہے۔ رملہ نامی کردار اس کلون کی ماں ہے۔ یہاں پر ششدر کر دینے والا اور ناقابل یقین امر یہ واقع ہوتا ہے کہ وہ کلون پیدائش کے فوراً بعد گفتگو بھی شروع کر دیتا ہے۔ عدالت میں کلوننگ کے حق میں بحث کر کے مقدمہ بھی جیت لیتا ہے۔ یہ سائنس فینٹسی ہے۔ اس پر ہی یہ حیرت ختم نہیں ہوتی اس کے علاوہ وہ جب وہ کلون بچہ پانچ برس کی عمر میں پہنچتا ہے تو دنیا کے ہر موضوع پر مفصل بات چیت کر سکتا ہے۔ ناول میں تو فینٹسی کے توسط سے یہ دکھایا گیا ہے لیکن مستقبل کی سائنس کے لیے یہ سب چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

ناول میں شامل بہت سے واقعات ناقابل یقین اور فینٹسی ہیں تاہم نئے اور منفرد خیال پر ناول کی بنیاد قائم کرنے کی بدولت مصنف کو کامیابی کا حقدار کہا جا سکتا ہے۔

سائنسی فینٹسی کا اہم موضوع مستقبل کی سائنس اور انسان ہوتا ہے۔ اردو ادب میں اس طرز کے ناولوں کا آغاز "بیس سو گیارہ" سے ہوتا ہے۔ اس میں پیش کی گئی بہت سی باتیں اگر چہ دور حاضر میں حقیقت کا روپ دھار چکی ہیں تاہم "مشینوں کا شہر"، "پاگل خانہ"، "وادی گماں میں"، "زینو" اور "کلون" میں پیش کیے گئے تصورات کا تعلق مستقبل کی زندگی سے ہے۔ ان ناولوں میں پیش کیے گئے تصورات دور موجود اور آنے والے زمانے کے سائنس دانوں کے لیے تحدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ سلیم اختر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء)، ص ۱۶۳۔

۲۔ ممتاز احمد خان، اردو ناول کے بدلتے تناظر (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۷)، ص ۱۳۸۔

۳۔ اعجاز علی ارشد، کرشن چندر کی ناول نگاری (دہلی: ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء)، ص ۱۳۱۔

۴۔ ذوالفقار علی، روبوٹ کی دنیا (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۵۔

۵۔ کرشن چندر، مشینوں کا شہر (لاہور: نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۱۔

۶۔ ایضاً، ص ۵۶۔

۷۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۷۔

۹۔ نیلم فرزانہ، اردو ادب کی خواتین ناول نگار (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷)، ص ۵۹۔

۱۰۔ سید جاوید اختر، ناول نگار خواتین (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۰۸۔

۱۱۔ غفور شاہ قاسم، حجاب امتیاز علی تاج: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۱۹۔

۱۲۔ زاہدہ حنا، نرم گرم (اسلام آباد: روزنامہ ایکسپریس، ۱۹ نومبر ۲۰۱۷)۔

۱۳۔ غفور شاہ قاسم، حجاب امتیاز علی تاج :شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۹۔
۱۴۔ حجاب امتیاز علی، پاگل خانہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۸۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۰۔
۱۷۔ ممتاز احمد خان، اردو ناول کے بدلتے تناظر (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۴۰۔
۱۸۔ رحیم گل، وادی گماں میں (لاہور: رابعہ بک ہاوس، سن ندارد)، ص ۳۰۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۸۔
۲۰۔ ایضاً، ۹۹۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔
۲۲۔ محمد حمید شاہد، اردو فکشن: نئے مباحث (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۶)، ص ۲۷۵۔
۲۳۔ وحید احمد، زینو (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۰۹، ۱۰۸۔
۲۴۔ امجد طفیل، "پاکستانی اردو ناول اکیسوں صدی میں" مشمولہ اسالیب (کراچی: جولائی ۲۰۱۱ء تا دسمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۶۳۔
۲۵۔ عبد الرؤف شکوری، کلوننگ۔ ایک تعارف (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۳۴۔
۲۶۔ طفیل ڈھانہ، کلون (لاہور: دار الشعور، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۴۔

## تلخیص:

فینٹسی کسی بھی قصہ یا کہانی کا ایسا عنصر ہے جو بے بنیاد اور حقیقت کے برعکس ہوتا ہے۔ اس میں پیش کیے گئے کردار اور واقعات مافوق الفطرت ہوتے ہیں۔ اسی طرح سائنسی موضوعات جو ثابت شدہ نہ ہوں بلکہ صرف مصنف کے تخیل کی پیداوار ہوں سائنسی فینٹسی میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ مقالہ "مشینوں کا شہر"، "پاگل خانہ"، "وادی گماں میں"، "زینو" اور "کلون" ایسے ناولوں میں سائنسی فینٹسی عناصر کے تحقیق و تجزیہ پر مشتمل ہے۔